

تحریک اسلامی اور اجتماعی تبدیلی

حکمت عملی کے چند خطوط کار

ڈاکٹر انیس احمد

عالمی تحریکات اسلامی کو اقامتِ دین اور تبدیلی نظام کی جدوجہد میں عموماً پائچ بیانیادی مراحل سے گزرنما پڑتا ہے۔

ذاتی اصلاح اور تزکیہ

اویں مرحلہ مقصدِ حیات کے شعور و آگہی کے نتیجے میں اپنی فکر اور ذاتی زندگی میں اصلاح اور تزکیہ کا عمل ہے۔ اس مرحلے میں ایک فرد جو کل تک رواتی مذہبی ماحول میں پل بڑھ کر زندگی کو دوخانوں میں تقسیم سمجھتا تھا کہ ایک خانہ عبادت اور تقویٰ کا ہے جس میں نمازوں کا اہتمام، روزے کی پابندی، عمرے اور حج کی سعادت اور کمائی ہوئی دولت اور کاروبار یا کاشت کاری میں سے ایک حصہ بطور زکوٰۃ کے ادا کر دینا۔ یہ تمام کام اگر جزوی طور پر بھی کر لیے گئے تو ایک شخص کی شہرت دین دار فرد کی بن جاتی ہے اور وہ خود بھی مطمئن رہتا ہے کہ اُس نے اللہ سبحانہ، و تعالیٰ کا حق ادا کر دیا۔ اس کے ساتھ اگر اُس نے والدین کی خدمت سال میں ایک مرتبہ اپنے کاروباری مرکز سے جا کر ان کو شکل دکھا کر کر دی یا انھیں کوئی رقم بھیج دی تو وہ سمجھتا ہے کہ اس نے تمام فرائض پورے کر دیے۔ دوسرا خانہ اس کی کاروباری اور پیشہ ورانہ زندگی کا ہوتا ہے جس میں وہ بطور تاجر، بطور طبیب، بطور استاد، بطور سرکاری ملازم مقررہ وقت پر حصولِ نفع کے لیے کام کرتا ہے اور جس شعبے سے تعلق ہو اُس کے رواج کو بنیاد بنا کر شہرت حاصل کرتا ہے۔ چنانچہ اگر وہ کاروباری ہے تو

کاروباری برادری میں مروجہ طریقوں کی پیروی کرتا ہے، چاہے ان میں اسے جھوٹ بولنا پڑے اور اپنے مال کو فروخت کرنے کے لیے دوسروں کے حقوق کو پامال کرنا پڑے۔ وہ کم سے کم وقت میں زیادہ سے زیادہ نفع کے حصول کی دوڑ میں شامل ہو کر دوسروں سے آگے گزدھنا اور اپنا مقام پیدا کرنا چاہتا ہے۔ اگر وہ سرکاری ملازم ہے تو اپنی تمام نمازوں اور روزوں کے ساتھ وہ اپنے سے اعلیٰ افسر اور اقتدار پر قابض افراد کو اپنا مالک اور رب مانتے ہوئے ہر لمحہ ان کی خوش نودی اور بندگی کے ذریعے اپنا مقام پیدا کرنا چاہتا ہے۔ وہ ہوا کے رُخ کو دیکھ کر چلتا ہے اور حکمران جماعت کے ہر حکم کو اپنی ذہانت کے استعمال سے نافذ کرنے میں سرگرم رہتا ہے۔

زندگی کے یہ دو خانے نہ صرف عام کاروباری انسان یا پیشہ و رفراہی نہیں، بلکہ ان میں سے بھی کچھ جو دین کے خدمت گار سمجھے جاتے ہیں وہ بھی زندگی کو عملًا ان دو خانوں میں تقسیم کرنے کو عین دین کے مطابق سمجھتے ہیں اور اس طرح شعوری یا غیر شعوری طور پر دین و دنیا کے الگ الگ اصولوں پر عمل پیرا رہنے میں عافیت سمجھتے ہیں۔ چنانچہ منبر و محراب سے جس اعلاء کلمۃ الحق پر خطاب ہوتا ہے یا معاشرتی حقوق پر دل گداز اظہارِ خیال کیا جاتا ہے اپنے گھر اور اپنی برادری میں شادی یا ہبہ کے موقع پر ان تمام اصولوں اور خطابات کے برخلاف وہ تمام رسوم ادا کی جاتی ہیں جن کی بنیاد ہندو مت، قبائلیت اور جاہلی برادری کے نظام میں پائی جاتی اور جو دین اسلام کی واضح تعلیمات سے نکراتی ہیں۔ ایسے تمام موقع پر کہا جاتا ہے کہ آخر برادری میں رہنا ہے، اگر یہ سب کچھ نہ کیا گیا تو برادری والے کیا کہیں گے۔ زندگی میں یہ تقسیم آج کے دور کی پیداوار نہیں ہے۔ یہ تقسیم جب سے انسان نے شعور کی آنکھ کھوئی ہے، پائی جاتی ہے۔ اسی لیے قرآن کریم نے کہا تھا کہ وَهَدَنَاهُ النَّجْدَيْنِ (البلد: ۹۰) ”ہم نے دونوں راستے دکھادیئے“ حق و باطل کی نشان دہی اور اچھائی اور بُرائی کے راستوں کا علم ہونے کے باوجود، روایتی مذہبیت زندگی کو دو خانوں میں تقسیم کرنے میں کوئی ہرج نہیں سمجھتی بلکہ فخر سے اس بات کا اظہار کرتی ہے کہ دین و دنیا دونوں میں توازن رکھنا ہی اسلام ہے۔ چنانچہ زندگی میں تقسیم کے ذریعے بیک وقت دو خداوں کی بندگی کرنے سے فتن کو کامیاب زندگی قرار دیا جانا ہے۔ قرآن کریم دوسری جانب یہ واضح ہدایت دیتا ہے کہ اللہ وحدہ لا شریک کی بندگی کرتے ہوئے انسان پورے کا پورا اسلام میں داخل ہو جائے۔ اذْخُلُوا فِي السَّلْمِ كَافَةً ص

وَلَا تَتَّبِعُوا خُطُوطَ الشَّيْطَنِ (البقرہ ۲۰۸:۲)، ”اے ایمان لانے والوں تم پورے کے پورے اسلام میں آ جاؤ اور شیطان کی پیروی نہ کرو۔“

تحریکات اسلامی قرآن کریم کے اس مطابق کو اپنی دعوت کا اولین نکتہ قرار دیتی ہیں اور جب بھی ایک شخص کا تحریکی شعور جاتا ہے وہ زندگی میں اس تقسیم سے نجات حاصل کر کے اپنی ذاتی اور گھریلو زندگی میں، اپنے کاروبار اور اپنے تمام دنیاوی معاملات میں صرف اور صرف اللہ سبحانہ و تعالیٰ کا بندہ بن کر اپنے تمام معاملات کو صرف اس کی رضا کا تابع فرمان کر دینے میں لگ جاتا ہے۔

تحریک اسلامی کی دعوت پر بلیک کہنے والوں میں ایک بڑی تعداد ان افراد کی بھی پائی جاتی ہے جو پہلے جاہلیت کی زندگی گزارتے تھے اور نجی زندگی میں بھی اسلام کے احکام اور تعلیمات کی پاسداری نہیں کرتے تھے لیکن جب اللہ نے انھیں ہدایت دی تو بتدریج انھوں نے اپنی ذاتی اور گھریلو زندگی کے تضادات ڈور کرنے کی بھرپور کوشش کی اور وہ اس دعوت کے نتیجے میں ایک نومسلم کے جذبے کے ساتھ اپنی زندگی کو مکمل طور پر عبد یت میں تبدیل کرنے میں لگ جاتے ہیں۔

اہلِ خانہ پر توجہ

دوسرے مرحلہ ان کا اپنی ذات سے آگے بڑھ کر اپنے اہلِ خانہ کو اس نئے شعورِ حیات سے واقف کرانا اور اپنی عملی زندگی کے نمونے کے ذریعے بندگیِ رب کی دعوت دینا ہے۔ تحریک اسلامی کا ہر کارکن اور ہر ہم خیالِ فردِ اللہ تعالیٰ کے سامنے اس بات پر جواب دہے کہ جو ہدایت اُس تک پہنچی اس نے اسے اپنے اہلِ خانہ تک پہنچایا ہے اور اپنے عمل سے کس حد تک اس دعوت کی عملی مثال پیش کی۔ اگر وہ بڑے بڑے اجتماعات میں تزکیہ نفس پر تقاریر کرتا ہے اور گھر میں اس کا طرزِ عمل ایک جابر اور نفس پرست انسان کا ہے اور وہ صرف اپنے آرام، اپنی سہولت، اپنی ذات کو اہمیت دیتا ہے تو اس نے خود ابھی تک دعوت کا صحیح شعور حاصل نہیں کیا۔ یہ مرحلہ آسان نہیں ہے، نہ مختصر ہے بلکہ مسلسل شعوری جدوجہد کا مطالبہ کرتا ہے اور عین ممکن ہے مسلسل کوشش کے باوجود بھی ایک کارکن اپنے اہلِ خانہ کو مکمل طور پر تحریکی شعور نہ دے سکے۔ قرآن کریم بعض انبیاء کے کرام کے واقعات بیان کر کے سمجھاتا ہے کہ یہ امکان بھی ہو سکتا ہے کہ بہترین کوشش کے باوجود ایک بیوی یا ایک بیٹا یا ایک بیٹی سر برہا خاندان کی طرح دعوت کو اختیار نہ کرے۔ ایسی شکل میں قرآن نا امیدی کی تعلیم

نبیس دیتا بلکہ آخروقت تک کوشش کرتے رہنے کا حکم دیتا ہے۔ اہم بات جو اس مرحلے میں ہر کارکن کے لیے قابل غور ہے وہ اس کی کامیابی سے بھی کہیں زیادہ اہم اس کی وہ خلوص کوشش ہے جو اسے اس دنیا اور آخرت دونوں جگہ بہترین اجر کا مستحق بناتی ہے، یعنی رضاۓ الہی کا حصول۔

قرب و جوار میں شعور کی بیداری

تیرا مرحلہ اپنے خاندان سے آگے نکل کر اہل محلہ اور ارگرد کے معاشرے کو دینی شعور سے آگاہ کرنے کا ہے اور اس میں سب سے زیادہ بنیادی کردار مسجد اور معاشرتی فلاح کے کاموں کا ہے۔ اگر ایک کارکن مسجد میں نظر نہیں آتا اور ہر عوامی مظاہرے میں سب سے آگے دکھائی دیتا ہے تو یہ اس دعوتی مرحلے کی کمزوری کی علامت ہو گی اور ایک عام فرد اسے سیاسی کارکن تو سمجھے گا دین کا کارکن نہیں سمجھے گا۔ مسجد میں چند لمحات کے لیے قرآن کی تلاوت اور اگر ممکن ہو تو ایک ایسے حلقة کا قیام جو صرف قرآن کریم پر غور کرنے کے لیے قائم ہو، اس مرحلے کی بنیادی ضرورت ہے۔ ان تمام مشکلات کے علی الرغم جو مساجد کے حوالے سے ہمارے معاشرے میں پائی جاتی ہیں اگر حکمت سے کام کیا جائے تو قرآنی حلقة کا قیام ممکن ہے۔ آخر بعض تبلیغی جماعتوں کے افراد ہر مسجد میں کھڑے ہو کر مقررہ جملوں میں اپنی بات کہتے ہیں۔ پھر کیا وجہ ہے کہ ایک فرد یہ بات نہ کہہ سکے کہ نماز کے بعد پندرہ منٹ کے لیے قرآنی حلقة ہو گا اس میں شرکت کی درخواست ہے۔

اگر یہ کام خلوص نیت سے ذاتی آنا کو رد کرتے ہوئے کیا جائے گا تو ان مساجد میں بھی جہاں تحریک کے ساتھ فکری، ہم آہنگی موجود نہ ہو وہاں بھی ان شاء اللہ کامیابی ہو گی۔ یہاں بھی یہ بات یاد رکھنے کے لائق ہے کہ اگر ایک کارکن جو اہل محلہ سے نہ ملتا ہے نہ ان کے غم اور خوشی میں شرکت کرتا ہے اور چاہتا ہے کہ مسجد میں اس کے اعلان پر لوگ درس میں شرکت کر لیں تو وہ خام خیالی میں مبتلا ہے۔ ایک کارکن کا طرزِ عمل ہی اسے عوام الناس میں تحریک کی دعوت سے روشناس کرانے کا اصل ذریعہ ہوتا ہے۔

دعوت کے مختلف موقع کا استعمال

چوتھا مرحلہ اہل محلہ سے آگے بڑھ کر اپنے گاؤں اور اپنے شہر میں ان موقع کا استعمال کرنا

ہے جو تحریکی دعوت کو عام کرنے کا ذریعہ بن سکیں۔ یہ ماہنہ فکری حلقة بھی ہو سکتا ہے ادبی حلقة بھی، اور معاشرتی فلاج کے کاموں کا ایک سلسلہ بھی۔ یہ بینہک اسکول بھی ہو سکتا ہے۔ یہ خواتین کے لیے طبی مشورہ اور امداد کا مرکز بھی ہو سکتا ہے۔ یہ سلامی سکھانے کا ادارہ بھی ہو سکتا ہے اور یہ محلے کے بچوں یا بچیوں کو مختلف درجوں میں کوچنگ فراہم کرنا بھی ہو سکتا ہے۔ فلاجی کام وہ سنت ہیں جنہیں اگر خلوص نیت کے ساتھ کیا جائے تو دعوت کے پھیلنے کو کوئی نہیں روک سکتا۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا کسی بوڑھی خاتون کی عیادت کرنا اور حضرت ابو بکرؓ کا خلافت کے بعد بھی ایک بوڑھی خاتون کی بکریوں کا دودھ دو ہنا خدمتِ خلق کی وہ واضح مثالیں ہیں جن پر عمل کرنا سنت پر عمل کرنا ہے۔

شہروں اور گاؤں میں طبی مرکز، تعلیمی مدارس، یتامی اور ناداروں کے لیے تربیتی و تعلیمی اداروں کا قیام، خواتین کے حقوق کے لیے جدوجہد یہ وہ اہم کام ہیں جو دعوت کے لازمی مرافق میں شامل ہیں۔ اگر تحریکی کارکن یا قائدین ایسے تعلیمی مرکز تو قائم کر دیں جن میں سرکاری نظامِ تعلیم کے نصاب کے مطابق بیکٹوں اور ہزاروں بچوں کو تعلیم دی جا رہی ہو لیکن ان طلبہ و طالبات کے ساتھ اساتذہ کا طرزِ عمل کاروباری ہو، اور رضاۓ الہی کے حصول کی جگہ محض تنخواہ کا حصول مقصد بن گیا ہو تو پھر بظاہر تعلیمی شعبے میں کام پھیلنے کے باوجود اس کی دعویٰ افادیت صفر بلکہ منفی صفر رہے گی۔ اس حوالے سے اعلیٰ ترین سطح پر اور انتظامی سطح پر یہ غور کرنے کی ضرورت ہے کہ اگر تحریک اسلامی سے وابستہ افراد کی زیر نگرانی اسکولوں کا ایک سلسلہ (chain) موجود ہے جس میں ایک ایک اسکول ستم نے تین تین سو اسکول قائم کر رکھے ہیں تو کیا ان اسکولوں کے طلبہ و طالبات اور ان کے والدین تک دعوت مؤثر طور پر پہنچائی گئی یا نہیں؟ اگر اس بڑے دعویٰ بنکو ضائع ہونے دیا گیا اور محض ہر اسکول میں طلبہ کی تعداد بڑھانے کو مقصد بنا لیا گیا تو پھر یہ دعوت سے صریح انحراف ہے۔ طلبہ کے والدین تک پیغام پہنچانے سے یہ مراہنیں ہے کہ اسکول کے سالانہ پروگرام میں دین اسلام پر کوئی جوشیلی تقریر ہو جائے بلکہ اسکول کی نصابی سرگرمی کے علاوہ ہم نصابی سرگرمیوں کے ذریعے طلبہ و طالبات میں دین کا شعور، بنیادی تصورات کی وضاحت اور ان کے ذریعے ان کے والدین سے قریبی رابطہ تاکہ ان کے سامنے ایک ایسا عملی مذہل آئے جس میں اعلیٰ مہارت کے حصول کے ساتھ وہ اپنے بچے میں سیرت و کردار کی تبدیلی دیکھ سکیں اور خود ان کو والدین اساتذہ اجتماعات

کے ذریعے دعوت کا شعور دینا، انھیں مختلف مواقع پر دعوت دے کر تبادلہ خیال کے ذریعے تحریک سے قریب لانا۔ اگر صرف تحریک اسلامی کے افراد کے قائم کردہ اسکولوں میں بچوں اور ان کے والدین تک دین کا صحیح تصور دیا جائے اور عملًا اسلامی اخلاق پر عمل کیا جائے تو تباہ کے لحاظ سے یہ کسی عظیم الشان جلسے یادھرنے سے کم موثر نہیں ہو سکتا۔ اگر صرف اسکولوں کے سلسلے کو صحیح طور پر استعمال کر لیا جائے تو ہزاروں لاکھوں گھروں تک اللہ کے دین کا پیغام پہنچ سکتا ہے اور یہ لوگ آخر کار اپنے سیاسی تصورات پر غور کرنے پر آمادہ ہوں گے اور دعویٰ و وٹ سیاسی و وٹ میں تبدیل ہو سکتے گا۔

مؤثر دعوت اور افراد کی تنظیم سازی

پانچواں مرحلہ قومی سطح پر اپنی دعوت کو موثر انداز میں ملک کے مختلف طبقات تک پہنچانے اور ملکی سطح پر ان افراد کو ایک تنظیم میں شامل کرنے کا ہے جو دعوت سے اتفاق رکھتے ہوں۔ یہی وہ مرحلہ ہے جس میں خود تحریکی ذہن رکھنے والے افراد خلوص نیت کے ساتھ ایک سے زائد طریق کار اور حکمت عملی کے ممکن ہونے کی بنا پر بعض اوقات مغالطے کا شکار ہو جاتے ہیں۔ اس پانچویں مرحلے کے اولين حصے پر، یعنی اقامت دین کی دعوت کو کس طرح اس کے مخاطبین تک پہنچایا جائے؟ ایک سے زائد طریق کار کا وجود بارہا یہ سوال ذہن میں اٹھاتا ہے کہ کیا جو طریق کار دعوت کے لیے اختیار کیا گیا ہے یہی سب سے زیادہ مناسب اور سنت انبیا کی روح اور مثال سے قریب ہے یا اس کے علاوہ دیگر طریقہ ہاے کا ربھی حصول مقصد کے لیے اختیار کیے جاسکتے ہیں؟

بعض حضرات کے نزدیک اگر صرف عبادات کے صحیح طریقے کی اصلاح کر لی جائے تو دین کی اقامت ہو جاتی ہے چنانچہ وہ عبادات کی ظاہری شکل پر اپنی توجہ مرکوز رکھنے کو کافی سمجھتے ہیں۔ کچھ حضرات زندگی کے اسلامی ہونے کے لیے قلب کو مرکز قرار دیتے ہوئے اس بات پر زور دیتے ہیں کہ قلب کی اصلاح ہر شے پر مقدم ہے اور اس غرض سے اذکار اور اراد کا اہتمام ساری توجہ کا مرکز بن جاتا ہے۔ بلاشبہ مسنون اذکار اور ادعا تکمیل فس کا اہم ذریعہ ہیں لیکن اگر باقی امور کو نظر انداز کر کے صرف اذکار کو دین سمجھ لیا جائے تو اس کا نتیجہ یہ ہو گا کہ کاروبار حیات کے بہت سے اہم معاملات کو ترکیہ قلب کی روح کے منافی سمجھتے ہوئے ترک کر دیا جائے گا اور دین و دنیا کی تقسیم کو مزید مستحکم کر دیا جائے گا اور اللہ والے افراد خانقاہوں اور زاویوں میں گوشہ نشین ہونے اور

دنیاوی معاملات کو خیر باد کہنے میں اپنی عافیت سمجھیں گے۔ یہ طرز فقر روحانیت میں اضافے کو بنیادی اہمیت دیتا ہے تاکہ قلب کی دنیا میں تبدیلی آجائے اور قلب اللہ تعالیٰ کے نور سے بھر جائے تو پھر نظامِ کفر ہو یا استحصالی معاشرہ ہر ایک فرد خود بخود ٹھیک ہو جائے گا۔

ایک طرف یہ روایہ ہے تو دوسری طرف منج نبویؐ کا گھری نظر سے مطالعہ کرنے اور قرآن و سنت سے استدلال کرتے ہوئے انبیاء کرام کے طریق کار کے تجزیے کے نتیجے میں ایک نقطہ نظر یہ سامنے آتا ہے کہ اقامتِ دین کے تقاضوں کو پورا کرنے کے لیے حضرت سلیمان سلطنت اور حکومت کو قائم فرماتے ہیں۔ حضرت داؤڈؑ کو اللہ تعالیٰ خلافت کے منصب پر خود فائز فرماتے ہیں اور خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کو مدینہ منورہ میں مقامِ قیادت اور تھوڑے عرصے میں فاتحِ مکہ کی حیثیت سے حضرت ابراہیمؑ کے شہر میں داخل فرماتے ہیں۔ آپؑ مدینہ منورہ میں یہیں الاقوامی معابدے کرتے ہیں۔ مختلف ممالک کے فرماں رواؤں کو مدینہ منورہ میں قائم شدہ اسلامی ریاست کے امیر اور اللہ کے نبیؑ کی حیثیت سے دعوتی خطوط تحریر فرماتے ہیں۔ قرآن کریم کی مقرر کردہ تعلیمات کو خاندانی معاملات میں، معیشت میں اور تعزیریاتی معاملات میں حکومتی اختیارات کے ذریعے نافذ فرماتے ہیں۔ گویا عملاء کر کے دکھاتے ہیں کہ ترکیہ محض قلب کا نہیں بلکہ معیشت و سیاست کا ترکیہ بھی یکساں طور پر بنیادی اہمیت رکھتا ہے۔

اس نقطہ نظر کی روشنی میں جو طریق کار اور حکمت عملی تحریکاتِ اسلامی اختیار کرتی ہیں وہ انبیاء کرام کے طریق دعوت سے براہ راست ماخوذ اور اسی پر مبنی ہوتی ہے۔

سیاسی سطح پر تعاون اور عدم تعاون

پانچویں مرحلے کے اس اوپریں پہلو کے ساتھ ہی جو دوسرا ہم پہلو ہمارے سامنے آتا ہے، اس کا تعلق دعوت سے متاثر افراد کی تنظیم، ان میں دعوت کی تطبیق اور جو لوگ دعوت سے اتفاق نہ کرتے ہوں ان کے ساتھ تعلقات کی نوعیت کا ہے۔ تحریک اسلامی کا تنظیمی ڈھانچا کیا ہو؟ کیا یہ ضروری ہے کہ تحریک ہر کام خود کرے یا وہ بعض مقاصد کے حصول کے لیے تقسم کار کے اصول پر عمل کرتے ہوئے اپنی عمومی رہنمائی اور تائید کے ساتھ تحریک کے ہم خیال افراد کو معاشی خدمتِ خلق یا سیاسی معاملات میں بڑی حد تک خود مختاری کے ساتھ کام کا موقع دینی حکمت عملی کے ایک

حکتے کے طور پر اختیار کرے؟

اسی طرح اس مرحلے میں یہ امر بھی غور طلب ہو گا کہ کیا تحریک ہمیشہ سیاسی مجاز پر اپنی دعوت اور اصولوں کی بناء پر تہبا سیاسی مجاز پر کام کرے یا وقتی طور پر دیگر سیاسی جماعتوں سے متعین وقت کے لیے تعاون کو حسب ضرورت اختیار کرے؟ ایک زاویہ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ دیگر سیاسی جماعتوں سے کسی قیمت پر اتحاد یا اشتراک نہ کیا جائے اور مکمل طور پر اپنے افرادی اور مادی وسائل پر بھروسہ کیا جائے، چاہے تحریک کو حصوں مقصود میں سود و سوال لگ جائیں۔ وہ ہر کام اپنے نظریاتی اصولوں کے مطابق کرے اور کسی کے ساتھ مخصوص اہداف کے لیے بھی تعاون و اشتراک پر غور نہ کرے۔

دوسروں سے عدم تعاون کے نقطہ نظر کے لیے فکری بنیاد عوماً قرآن و سنت کے بعض جزوی احکام سے اخذ کرنے کی کوشش کی جاتی ہے اور اسلام اور جاہلیت، اسلام اور طاغوت، اسلام اور کفر کا مقابلہ کرنے کے بعد یہ نتیجہ اخذ کیا جاتا ہے کہ جو جماعتوں اپنے اہداف اور دعوت کے لحاظ سے قرآن و سنت کی تعلیمات سے انحراف کرتی ہوں وہ جاہلی جماعتوں ہیں اور ان کے ساتھ کسی معاملے میں تعاون کرنا اسلام کے منافی ہے۔

اقامتِ دین اور قیامِ نظامِ اسلامی کی جدوجہد کے اس پانچویں مرحلے میں جو ملک گیر بنیاد پر دعوتِ دین کو حکمت کے ساتھ عوامِ الناس تک پہنچانے اور انھیں منظم کرنے کا ہے، دعوتی اور سیاسی تنظیمِ بنیادِ علوم یک جان ہو جاتی ہے۔ بالکل اسی طرح جیسے مکہ سے مدینہ منورہ آنے کے بعد اسلام کے عالم گیر دعوتی اصول بالخصوص دعوتِ توحید، معیشت اور سیاست کے شعبے میں انقلاب لانے کا سبب بنتی۔ اس مرحلے میں تحریک اسلامی کے لیے قابل غور پہلو یہ ہے کہ جس طرح اس کی دعوت کا منطقی اور قرآن و سنت پر مبنی ہونا عوام کو مطمئن کرتا ہے کہ یہ دعوت حق ہے، کیا وہی افراد جو اس کی دینی دعوت کو پسند کرتے ہیں تحریک کی سیاسی حمایت اور اُس کے حق میں اپنے ووٹ کا استعمال کرنا پسند کرتے ہیں؟ کہیں ایسا تو نہیں کہ تحریکی کارکنوں کے خلوص اور قربانی کا اعتراف کرتے ہوئے ان کی دعوت کو تو پسند کیا جا رہا ہو لیکن سیاسی فیصلے میں وفاداری، برادری، موروڑی سیاست دانوں یا جذبائی نعرے بلند کرنے والوں کے ساتھ ہو اور اگر بالفرض ایسا ہے تو تحریک کی دعوت کی حکمت عملی اس پہلو کو حل کرنے کے لیے اور ان افراد کو جیتنے کے لیے جو دعوت کو تو پسند

کرتے ہیں لیکن ووٹ ڈالتے وقت جذبات یا پرانی وابستگی سے متاثر ہو جاتے ہیں، کیا موثر اقدامات کرتی ہے؟ اس مرحلے میں یہ بات بھی شامل ہے کہ رضاۓ الہی کے حصول کے لیے اگر بعض ایسے سیاسی طبقات کے ساتھ وقٹی اور جزوی تعاون کرنا پڑ رہا ہے جو چاہے اپنی ذات میں اسلام کے اعلیٰ اصولوں پر عامل نہ ہوں لیکن اس تعاون کے نتیجے میں ملک میں اسلامی معاشرہ اور نظامِ عدل قائم کرنے کے امکانات پیدا ہو رہے ہوں تو تحریک کائن کے ساتھ تعاون کرنا وسیع تر حکمت عملی کا ایک جزو سمجھا جائے گا نہ کہ مذاہست کی کوئی شکل! بات بہت واضح ہے، ایسے حالات میں سیاست شرعیہ کا تقاضا ہے کہ ایسے جزوی تعاون کو اختیار کر کے بڑے مقصد کے حصول کے راستے کو ہموار کیا جائے۔ ایسا تعاون کفر اور طاغوت کے ساتھ تعاون قرار نہیں دیا جا سکتا۔

عصر حاضر کے تحریک اسلامی کے نام و مرکزیں سید ابوالاعلیٰ مودودی^ر اور سید قطب شہید^ر نے اسلام اور جاہلیت کے حوالے سے جو تصور پیش کیا ہے وہ کسی تعارف کا محتاج نہیں۔ ایک جانب وہ طاغوتی نظام کے خلاف فکری، دستوری اور عملی جہاد کا تصور پیش کرتے ہیں اور دوسری جانب طاغوتی نظام کے زنجیری حلقات کو توڑنے کے لیے نقطہ آغاز کے حوالے سے یہ تصور پیش کرتے ہیں کہ اگر اصولی طور پر ایک ریاست اپنے آپ کو غیر اسلامی ریاست قرار دیتی ہو، مثلاً خود کو سکیور کہے تو اس کے ساتھ سیاسی معاملات میں شرکت نہ کرنا افضل ہوگا، جب کہ ایک ریاست اصولی طور پر خود کو اسلامی ریاست اپنے دستور کی دفعات کے ذریعے قرار دے لیکن نظام حکومت ابھی مکمل طور پر اسلامی نہ ہو تو اس کے معاملات کی اصلاح کے لیے دستور کی روشنی میں معاملات میں شرکت نہ کرنا دین کی حکمت کے منافی ہوگا۔ ایسے حالات میں امت مسلمہ کی فلاح اور حقوق کے حصول کے لیے آواز بلند کرنا، سیاسی جدوجہد کرنا اور اس جدوجہد میں دیگر جماعتوں کے ساتھ اس مقصد کے حصول کے لیے تعاون کرنا دین کی حکمت کے مطابق ہوگا۔ اس کی مثال ایک نو مسلم کی حیثیت سے بھی سمجھی جاسکتی ہے جس کا صرف اقرار ایمان اسے مسلمان بنادیتا ہے۔ گواہی اسلامی شعور اور کردار کا حصول ایک وقت لے گا، بلکہ مدت عمر کا مرتقاً ضی ہوگا۔

حکمت عملی کے حوالے سے دوسرا اقدام مروجه نظام میں موجود افراد کو اس تبدیلی کے لیے آمادہ کرنا ہوگا اور اس غرض سے پارلیمان ہو یا ایوان تجارت، جامعات ہوں یا سرکاری دفاتر،

فوج ہو یا نہ ہی امور میں رہنمائی کرنے والے افراد ہر ایک سے رابطہ، تبادلہ خیالات اور ان تمام اداروں میں ایسے افراد کو داخل کرنا ہو گا جو ان مختلف مجازوں پر دین کے مفاد کا تحفظ کر سکیں۔ اسی کا نام دین کی حکمت ہے۔ قرآن کریم اس سلسلے میں حضرت یوسفؐ کے ایک ایسے نظام میں جو بظاہر شریعت الہی پرمنی نہ تھا داخل ہو کر اس کی اصلاح کرنے کی حکمت عملی ہمارے سامنے پیش کرتا ہے تاکہ اولوالا لباب اس پر غور کریں اور حالات و موقع کے لحاظ سے اللہ کے ایک برگزیدہ نبیؐ کے اسوہ کی پیروی کرتے ہوئے چاہے پاریمان ہو یا ایوان تجارت، عدیلہ ہو یا دیگر اہم ادارے، ان میں شمولیت کر کے اندر سے اصلاح کے عمل کو آگے بڑھایا جائے۔ اگر ایسا نہیں کیا جائے گا تو یہ سیاست شرعیہ اور مصلحت عامہ کے اصولوں کے منانی ہو گا۔

یہاں یہ بات واضح کر دینی ضروری ہے کہ ایک اصولی اور دستور اسلامی ریاست اور ایک عملانہ غیر اسلامی ریاست میں دینی حکمت عملی یکساں نہیں ہو سکتی۔ دین کی بنیادی دعوت بلاشبہ ایک ہی ہو گی، یعنی نفس، معاشرہ، معیشت اور سیاست کے خداوں سے نجات حاصل کر کے صرف اور صرف خالق کائنات کی حاکیت کا قیام اور اسلام کے نظامِ عدل کا قیام۔

ہم یہاں ایک اصولی، دستوری اور اسلامی ریاست کی بات کر رہے ہیں جس میں چاہے عملانہ دین کی تمام تعلیمات پر سرکاری اداروں میں مکمل طور پر عمل نہ کیا جا رہا ہو۔ ایسی صورت حال میں تبدیلی کا عمل اسلامی منجع پر عمل کرتے ہوئے surgical operation سے بھی ہو سکتا ہے اور medical treatment سے بھی۔ دونوں میں کوئی تضاد نہیں۔ ایک میں اندر وہی طور پر تشخیص مرض کے بعد اندر سے اصلاح کرنے کے لیے معروف اور بر کے ذریعے نظام فساد کی اصلاح کی تدبیر کی جاتی ہے۔ چنانچہ حنات اور معروف میں بذریعہ اضافے کے ذریعے فساد جنم کو ختم کیا جاتا ہے، جب کہ سرجی میں، اس صورت میں جب دوسری دوائیں کام نہ کریں تو فساد کا سبب بننے والے اجزا کو نشتر کے ذریعے تراش کر الگ کر دیا جاتا ہے۔ ان دونوں کی بنیادی دین کے بنیادی اصولوں پر ہے۔ إِنَّ الْحَسَنَةَ يُدْهَبُنَ السَّيِّئَاتِ (ہود: ۱۱۲)، ”بلاشبہ بھلائیاں برائیوں کو دُور کر دیتی ہیں۔“ اس طرح فتنہ اور فساد کو دور کرنے کے لیے جگ کرنے کا حکم بھی قرآن کریم کی تعلیمات کا حصہ ہے۔ وَقَاتِلُوهُمْ حَتَّىٰ لَا تَكُونُنَ فِتْنَةً وَّ يَكُونَ الدِّينُ لِلَّهِ (البقرہ: ۱۹۳: ۲)،

”تم ان سے لڑتے رہو یہاں تک کہ فتنہ باقی نہ رہے اور دین اللہ کے لیے ہو جائے۔“
قرآن کریم اور سنت مطہرہ تبدیلی کے دونوں طریقوں کے لیے بنیاد فراہم کرتے ہیں اور ایک تیرے قرآنی اصول احسان اور مصلحت عامہ کے ذمہ دارانہ استعمال سے یہ فیصلہ کرنے کی دعوت دیتے ہیں کہ ایک مخصوص صورت حالات میں کس حکمت عملی کو اختیار کیا جائے۔ ان میں کوئی تضاد نہیں۔ یہ فیصلہ کہ کب تک طبابت سے کام لیا جائے اور کب نشرت کا استعمال ہو، ایک اجتہادی اقدام ہے۔ اس لیے کسی طریقے کو جائز اور حلال اور دوسرے کو مردود اور حرام قرار دے دینا، نہ دین ہے اور نہ دین کی تعلیم کر دہ عقل و حکمت سے مطابقت رکھتا ہے۔

کیا متوقع نتائج کا عدم حصول ناکامی ہے؟

یہ سوال اٹھاتے وقت کہ انتخابی سیاست میں ضرورتا حصہ لینے کے باوجود اگر متوقع نتائج حاصل نہ ہوں تو پھر اس سرگرمی کا کیا جواز ہے؟ بات بہت آسان سی ہے، جسے ہم بالعموم شدت جذبات میں نظر انداز کر جاتے ہیں، یعنی ہمارا اصل مقصد اللہ کی رضا کا حصول ہے یا ایک خاص تعداد میں نشتوں کا حصول؟ کیا سیاسی جدوجہد کا مقصد محض حصول اقتدار ہے یا اسلامی اخلاقی اصولوں پر منی دعوت کو عوام الناس تک پہنچا کر ان میں حق و باطل کے درمیان انتخاب کرنے کا شعور بیدار کرنا اور یہ یاد دہانی کرنا کہ وہ اپنے ذاتی مفادوں، برادری سے تعلق اور سیاسی وابستگی کے باوجود اللہ تعالیٰ کے سامنے جواب دی کے احساس کے ساتھ اپنا دووث کا حق استعمال کریں۔ اگر ہمارا مقصد اپنی دعوت پہنچانا اور دعوت کو بہتر طور پر پیش کرنے کے لیے ایوان نمائینگان میں پہنچ کر ملک میں اصلاح اور عدل کے نظام کا قیام ہے تو نشتوں کی کثرت یا قلت اور انتخاب میں بھرپور کامیابی یا ناکامی سے بلند ہو کر اپنے احصاب کی ضرورت ہے کہ ہم نے کس حد تک صحیح حکمت عملی اور اخلاقی اصولوں پر عمل کرتے ہوئے اپنی جدوجہد کو سرانجام دیا۔

اللہ تعالیٰ نے ان صالح افراد کی کامیابی کا وعدہ فرمایا ہے، جو خلوص نیت کے ساتھ اللہ کو اپنارب قرار دیتے ہوئے دین پر استقامت اختیار کر لیتے ہیں۔ وہ انھیں لازمی طور پر زمین میں خلیفہ بناتا ہے۔ سیاسی محااذ پر انتخاب میں کامیابی یا ناکامی ہو یا میدانی جہاد میں کفر و ظلم کے مقابلے میں صف آرا ہو کر جان کی بازی لگانا ہر دعویٰ جدوجہد اور جہادِ حق کے لیے قرآن کریم نے اسلامی

علمی اصول بیان کر دیا ہے کہ آخرا کارکامیابی اور سرفرازی دین کی ہوگی جو ایمان، خلوص، منزل کے شعور، دعوت الی اللہ اور ایثار و قربانی کے جذبے کے ساتھ آگے بڑھیں گے۔

وَ لَا تَهِنُوا وَ لَا تَحْزَنُوا وَ اَنْتُمُ الْأَعْلَوْنَ إِنْ كُتُّمْ مُؤْمِنِينَ ۝ (آل عمرن ۳: ۱۳۹)، دل شکستہ ہو، غم نہ کرو، تم ہی غالب رہو گے اگر تم مومن ہو۔

اسی بات کو ایک دوسرے انداز سے یوں فرمایا گیا:

إِنَّ الَّذِينَ قَالُوا رَبُّنَا اللَّهُ ثُمَّ اسْتَقَامُوا فَلَا خُوفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْرَجُونَ ۝ (احقاف ۲۶: ۱۳) یقیناً جن لوگوں نے کہہ دیا کہ اللہ ہی ہمارا رب ہے، پھر اس پر جم گئے، ان کے لیے نہ کوئی خوف ہے اور نہ وہ غمگین ہوں گے۔

اصل غور طلب بات یہ ہے کہ کیا یا سی جدوجہد میں ہم نے صرف اور صرف اللہ کو رب بناتے ہوئے استقامت اختیار کی یا اس جدوجہد میں جسے خالصتاً اللہ کے لیے ہونا چاہیے تھا کہیں ذات اور شخصیت تو درمیان میں نہیں آگئی یا چند لمحات ہی کے لیے سہی منصب کی طلب کا وسوسہ تو نہیں پیدا ہوا۔ حقیقت یہ ہے کہ اللہ کا وعدہ سچا ہے جب وہ فرماتا ہے کہ میں تحسین سر بلند (الاعلون) کروں گا تو وہ ایسا ہی کرتا ہے، کی ہماری جانب سے رہتی ہے۔ کبھی منصوبہ بندی میں کہ جو کام انتخابات سے ایک سال پہلے کرنے کا ہو، ہم نے دو ماہ پہلے کیا ہو یا حالات کا تجزیہ کہ ہم نے محض معلومات کے ایک ذریعے پر بھروسہ کیا ہو وغیرہ۔

کسی بھی جماعت کے لیے کامیابی کا حصول بڑی اہمیت رکھتا ہے خصوصاً ایسی جماعت کے لیے جسے اس کے ناقدين ملک کی سب سے زیادہ منتظم، نظریاتی جماعت کہتے ہوں۔ لیکن اس سے زیادہ اہم اس کا اپنے اصولوں پر قائم رہنا اور استھصال، بد عنوانی، رشوت اور اقربا پر وری پرمنی نظام کے خلاف جدوجہد کرنا ہے۔ بلاشبہ تبدیلی اور مکمل تبدیلی ہمارا اصل ہدف ہے لیکن اس ہدف کا سونی صد حصول پورے طور پر ہمارے ہاتھ میں نہیں۔ صحیح انداز میں کوشش ضروری ہے اور اس کا بار بار تقویٰ جائزہ بھی ضروری ہے لیکن خلاف گمان متاخر پر مایوسی کا کوئی جواز ہی نہیں۔ کامیابی اور ناکامی کا فیصلہ تو اللہ سبحانہ و تعالیٰ ہی کرتا ہے اور بعض اوقات بظاہرنا کامی بعد میں حاصل ہونے والی عظیم تر کامیابی کا ذریعہ بن جاتی ہے اور کبھی ہمت نہ ہاری جائے۔

یہی وجہ ہے کہ مطلوبہ اہداف کا حصول نہ ہونے کی شکل میں اسلام اپنے ماننے والوں سے مطالبة کرتا ہے کہ وہ ناؤمیدی کو کسی بھی راستے سے اپنے اندر داخل نہ ہونے دیں اور تجزییہ کر کے دیکھیں کہ ہماری جانب سے وہ کون سی کمی تھی جس کی بنا پر متاخر وہ نہ نکلے جن کی امید تھی۔ اس تجزییے کے ساتھ ہی اس بات کی بھی ضرورت ہوتی ہے کہ اقامتِ دین کی جدوجہد کو مزید آگے بڑھاتے ہوئے سیاسی تبدیلی کے عمل کو آیندہ بہتر طور پر کرنے کے لیے مطلوبہ اقدامات کیے جائیں۔

آیندہ کی حکمت عملی

یہ بات ہمیشہ پیش نظر کرنے کی ضرورت ہے کہ سیاسی حکمت عملی کو ہر حالت میں دعویٰ حکمت کا تابع ہونا چاہیے اور اصل مقصد اللہ کی رضا کا حصول رہنا چاہیے۔ اس مقصد کے حصول کے لیے حالات اور ضروریات کے لحاظ سے جو حکمت عملی وضع کی جائے اسے بھی وقاوف قاتی تقدیمی نگاہ سے دیکھنے کی ضرورت ہوگی۔ اس سلسلے میں چند بنیادی نکات پر غور کرنے کی ضرورت ہے۔

● صحیح دعویٰ زبان کا استعمال: قرآن کریم موعظ حسنہ کے استعمال کا حکم دیتے وقت ابلاغ کا بنیادی اصول سمجھاتا ہے کہ جس قوم یا طبقہ یا گروہ انسانیت کو دعوت کے لیے پکارا جائے اُس سے اس کی 'زبان' میں بات کی جائے (یوسف ۲:۱۲)۔ یہاں زبان سے مراد صرف لغت نہیں وہ الفاظ و تراکیب اور پورا بیان ہے جو مخاطب کو قریب لائے۔ اسلامی جماعتیں عموماً جن دعویٰ یا دستوری اصطلاحات کو روزمرہ استعمال کرتی ہیں انھی کو عوام کو خطاب کرتے وقت بھی استعمال کرتی ہیں، جب کہ دعوت کی زبان ہر طبقہ، ہر گروہ اور جماعت کے لحاظ سے وہ ہونی چاہیے جسے وہ appriciate کرے۔

غور کرنے کی ضرورت ہے کہ جو دعویٰ زبان استعمال کی گئی کیا وہ عوامی نفیات سے مطابقت رکھتی تھی یا جن امور پر ہمیں زور دینا چاہیے تھا کیا کسی اور نے ان عنوانات کو انغو اکر کے عوام کے دل میں اُترنے کا ذریعہ بنایا۔ کیا تحریک اسلامی نے ظلم، بدعنوانی، عدم مساوات اور عدم تحفظ، دہشت گردی، معاشی احتصال، بے روزگاری اور صحت سے متعلقہ امور کو ایسی زبان میں جو عوام کو متأثر کرے سیاسی مہم میں تذکرہ کیا؟ کیا تبدیلی کی ضرورت جیسے بنیادی امور پر عوام سے رابطے میں پہل کی اور انھیں یقین دلانے میں کامیاب ہوئی کہ وہ تبدیلی لانے کی صلاحیت رکھتی

ہے، یا ان موضوعات پر دیگر افراد نے زیادہ زور بیان کے ساتھ اپنی image بنائی، جب کہ تحریک اسلامی کے ایک پہلے سے قائم شدہ ذہنی خاکے کی بنابرائے ایک صاف افراد کی کم تعداد والی جماعت سمجھا جاتا رہا جس کو ووٹ دینے کے باوجود اس کے اکثریت میں آجائے کامکان کم نظر آتا ہو۔

● پیشے اور عمر کے لحاظ سے خطاب: کیا تحریک اسلامی نے ملک میں موجود مختلف طبقات کی نشان دہی کے بعد اپنے دعویٰ پیغام کو اپنے سامعین کی نفیات و ضروریات کے لحاظ سے پیش کیا، یا ہماری دعوت حضن اصولوں کی دعوت رہی جس میں اسلامی ریاست، مدینہ منورہ کے ماڈل کا قائم کرنا ہمارا بینیادی نعرہ رہا۔ کیا تاجروں، وکلاء، اساتذہ، محنت کشوں، خواتین اور خصوصاً ملک کی ۷۶ فی صد نوجوانوں کی آبادی کو ان کی زبان میں پُرمیں اور اعتماد کے لبجے کے ساتھ ان کے مسائل کے قابل عمل حل انھیں سمجھائے یا دستوری مسائل پر نظری بحث کو کافی سمجھا۔

● تبدیلی کا نعرہ: کیا حالات اور نظام کی تبدیلی کا نعرہ لگانے میں ہمارا پیغام اور لہجہ یہ بات سمجھانے میں کامیاب ہو سکا کہ ہم کس قسم کی تبدیلی لائیں گے اور اس تبدیلی سے نوجوانوں کو روزگار، تاجروں کو کاروبار بڑھانے کے لیے تحفظ، بچلی کی فراہمی وغیرہ جیسی ضروریات ایک مقررہ مدت میں فراہم کر سکیں گے۔

● انتہا پسندی: ملک میں راجح اس غلط فہمی کو کہ اسلامی جماعتوں دراصل انتہا پسند جماعتوں ہیں کس حد تک دلائل اور واقعات کی بنیاد پر رد کرتے ہوئے ایسے امور کو روشناس کرایا جو اعتدال پسندی کی علامت ہوں، یا نفاذِ شریعت کے نام کے ساتھ بننے والے مغربی تصور کو جو صرف اسلامی تعزیرات کے نفاذِ کو شریعت کا نام دیتا ہے، غیر ارادی طور پر تقویت پہنچائی۔ گویا تحریک کی دعوت نے کس حد تک لوگوں میں یہ احساس بیدار کیا کہ وہ نہ قدامت پرست ہے نہ مغرب پرست، بلکہ حالات کے لحاظ سے اسلام کی اعتدال پرمنی تعلیمات کو مناسب ترقی سے راجح کرنے کی صلاحیت اور عزم رکھتی ہے۔ ظاہر ہے یہ اسی وقت ممکن ہے جب اس بتدریج تبدیلی کا نقشہ وقت کی قید کے ساتھ عوام کے سامنے پیش کیا جائے۔

● خدمتِ خلق: دین کا نصف حصہ حقوق العباد سے تعلق رکھتا ہے اور تحریکات اسلامی نے مصر ہو یا ترکی، عوام کی خدمت کے پراجیکٹ کامیابی سے چلا کر ان کے دلوں کو جیتا ہے۔

کیا الخدمت کے ۹۰،۸۰ ہسپتال، زلزلے اور سیلا ب زدگان کی خبر گیری، ملک میں ٹیموں اور بیواؤں کی امداد، آغوش جیسا پراجیکٹ، ان میں سے کسی بھی کام کو قوم کے سامنے تعریف و صول کرنے کے لیے نہیں بلکہ خاکساری کے ساتھ قوم کے لیے تھفہ بنا کر پیش کیا، یا کسی اور جماعت نے اس قسم کے محدود کام کو اپنی کارکردگی اور انتظامی امور کی صلاحیت رکھنے کی دلیل کے طور پر پیش کیا اور عوام نے اسے مان کر اس پر اعتماد کا اظہار بھی کیا؟

زکوٰۃ و صدقات کی وصول یا بی او تقسیم خود ایک ایسا عظیم کام ہے کہ جو بھی اسے صحیح طور پر کرے گا وہ عوام الناس میں مقبول ہوگا۔ اس کے ساتھ تعلیم، صحت، آفات سے متاثر افراد کی خدمت، غرض یہ سارے کام جب اللہ کی رضا کے لیے کیے جائیں گے تو اللہ تعالیٰ اپنے خصوصی کرم سے دعوت کو مقبولیت دیں گے۔ تحریک اسلامی کو آیندہ پانچ سالوں کے لیے ایک واضح منصوبہ بندی کرنے کی ضرورت ہے کہ پہلے سال میں خدمت کے کام کو کہاں تک پہنچایا جائے اور آیندہ پانچ برس میں اس کا دائرة کہاں تک ہو۔

بعض سیاسی جماعتیں اقتدار میں آنے کے بعد حکومتی رقم کو اپنے آنہجمنی لیڈروں کی فاتح سمجھتے ہوئے تقسیم کر کے ملک میں لاکھوں افراد کو اپنا ممنون احسان بنا لیتی ہیں جو اخلاقی اور قانونی طور پر جرم اور گناہ ہے، جب کہ زکوٰۃ، صدقات و عطیات کی وصولی اور ان کی مناسب تقسیم ایک دینی فریضہ ہے اور تحریکات اسلامی اس کی زیادہ مستحق ہیں کہ وہ اس کام کو اپنے ہاتھ میں لیں اور معاشرے کے نادار افراد کی جائز امداد اور ان کی سیاسی تعلیم کا بندوبست کریں۔ کیا اس سلسلے میں شوریٰ طور پر کوئی منصوبہ بنایا گیا اور اس پر احتساب کے ساتھ عمل کیا گیا؟ اس سلسلے میں لوگوں کی غلط فہمی کہ زکوٰۃ کی رقم کا سیاسی استعمال نہیں کیا جا رہا، کا ذور کرنا بھی ضروری ہے۔

• تحریکی فکر سے وابستہ اسکولوں میں کام: کیا تحریکی فکر رکھنے والے اسکولوں کے اور مدارس کے طلباء اور ان کے والدین تک اپنی دعوت پہنچانے کے لیے والدین اور اسکول کے اساتذہ کی خدمات ایک منصوبے کے تحت حاصل کی گئیں اور کیا ان کا سروے کرنے کے بعد یہ جائزہ لیا گیا کہ انھیں مسلسل رابطے کے ذریعے کس طرح mobilize کیا جا سکتا ہے؟ ایک محدود اندازے کے مطابق اگر صرف تحریکی فکر سے وابستہ افراد کے اسکولوں کے طلباء اور ان کے والدین پر صرف

تین ماہ کام کیا جائے تو ایک بڑی تعداد اپنی رائے تحریک کے حق میں دینے پر آمادہ ہوگی۔

● استخلاف کی شرائط: اللہ تعالیٰ نے زمین پر اختلاف بطور اپنے ایک انعام کے وعدہ فرمایا ہے لیکن اس وعدے کے ساتھ بعض شرائط بھی وابستہ ہیں۔ کیا تحریک کے کارکنوں میں وہ للہیت اور اللہ کی کتاب اور رسول کی سنت سے وابستی پیدا ہو سکی جس کے بعد اللہ تعالیٰ اپنا انعام فرماتا ہے؟ کیا اللہ تعالیٰ کے اس انعام کا مستحق بننے کے لیے تحریکی کارکنوں اور قیادت نے بے لوٹی، اخلاص، قربانی، مقصد پر یقین اور اپنی ذاتی، کاروباری، معاشرتی زندگی میں وہ تبدیلی پیدا کی جو اللہ تعالیٰ کو پسند ہے، یا تحریک سے وابستگی کے باوجود اس کے کاروباری معاملات اور معاشرتی تعلقات، رواج، برادری اور مالی منفعت سے وابستہ رہے؟

● اسلامی کاروبار: مغربی سرمایہ دارانہ معاشی نظام کو خود مغرب میں ناکامی کا سامنا ہے۔ اس بات کی ضرورت ہے کہ آئندہ پانچ سالوں کے لیے اسلامی معاشی اصولوں پر مبنی اسلامی کاروباری ادارے قائم کیے جائیں اور عوام اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں کہ کس طرح سود سے پاک کاروبار کیا جاسکتا ہے اور اگر ایسے افراد اقتدار میں آجائیں تو وہ کس طرح پورے ملک کی معیشت کو پاکیزہ معیشت بناسکتے ہیں۔

● فہم قرآن: پہلے تو اس جائزے کی ضرورت ہے کہ کیا ملک گیر پیانے پر فہم قرآن کے حلقة گذشتہ تین برسوں میں باقاعدگی سے کام کرتے رہے اور کیا ان کی فیڈ بیک (feed back) حاصل کی گئی یا نہیں۔ ان حلقوں میں جن افراد نے قرآن کا پیغام پہنچایا ان آبادیوں میں ان کا اثر بڑھایا گھٹا۔ قرآن کا پیغام سمجھنے کے بعد سامعین میں کوئی تبدیلی ہوئی یا نہیں۔ اور اگر نہیں ہوئی تو ان کا سبب استاد کا طریقہ عمل تھا یا سامعین کے ذہن کو نہ سمجھنے اور ان کی سطح پر بات نہ کرنے کی وجہ سے وہ لوگ دعوت کو صحیح طور پر نہ سمجھ سکے۔ ان امور کا جائزہ اور اس کی روشنی میں آئندہ پانچ برسوں کا منصوبہ تیار کر کے اس کا نفاذ کا میابی کی ایک اہم شرط ہے۔

● الیکٹرانک میڈیا: آئندہ کی منصوبہ بندی میں ایک اہم ترجیح مؤثری وی چیلن کا قیام ہے۔ اگر ہر سال صرف کارکنوں اور ہمدردوں سے ۵۰۰ روپے مابانہ اس اہم ذریعہ دعوت کے قیام کے لیے جمع کیے جائیں تو صرف ایک سال بعد اتنا سرمایہ بغیر کسی کے آگے جھکے اور مانگے فراہم

ہو سکتا ہے کہ کسی صاحب خیر کے تعاون سے ایک مکان بکشکل ایک کنال کا لے کر اس سے کام کا آغاز ہو سکتا ہے۔ ہاں، جو بات بنیادی ہے وہ ایسے پروپیشل افراد کا جمع کرنا ہے جو اس فن میں مہارت رکھتے ہوں اور ایسی ٹیم جوان کو نئے موضوعات پر کام پر ابھار سکے۔ یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ ملک میں ذہنی رجحانات کو متاثر کرنے میں سب سے زیادہ خلائقی وی چینلوں کا ہے اور انھیں بُرا بھلا کہنے اور تنقید کرنے کی منفی ذہنیت سے نکل کر ثابت طور پر اپنا ایسا ادارہ قائم کرنے کی فوری ضرورت ہے جو فنی طور پر موجودہ خلائقی وی چینلوں سے برتر ہو اور جس میں نظریاتی بنیاد پر ترقیت، تعلیم، تربیت، دعوت، تجزیہ کیا جائے اور قوم کو تعمیری فکر کی طرف لاایا جائے۔ اگر اس سال بھی ۲۰۱۳ء میں اس کام کا آغاز رمضان الکریم سے کر دیا جائے تو اگلے رمضان تک ان شاء اللہ تحریک کی دعوت اعلیٰ فنی مہارت سے پیش کی جاسکتی ہے۔ آج اصل جنگ بھورے یا سفید بالوں والے ناصحین اور مغرب زدہ افراد کے درمیان ہے۔ آج خود ان گھروں میں جو اپنے آپ کو تحریک سے وابستہ بھختے ہیں، مدد یا نے نوجوانوں کو براہ راست متاثر کر کے میدان میں آنے پر آمادہ کیا۔ یہ کام اصل میں تو تحریک ہی کے کرنے کا تھا لیکن اب بھی وقت ہاتھ سے نہیں گیا ہے۔ اس سلسلے میں بجائے کسی قرارداد کے انتہائی عاجزانہ آغاز کر دینے کی ضرورت ہے۔ تبیر کام اس کا ہے جس کے لیے یہ کام کیا جا رہا ہے۔ وہ آسمان سے اور پاؤں کے نیچے سے وسائل دینے کا وعدہ کرتا ہے، شرط صرف خلوص نیت کے ساتھ میدان میں آجائے کی ہے۔ بلاشبہ اس کا وعدہ سب سے سچا ہے۔

ان چند امور کو سامنے رکھتے وقت اور تنقیدی جائزہ لیتے وقت یہ بات ہمیشہ یاد رکھنی چاہیے کہ کامیابی کا پیمانہ نشتوں کی تعداد بھی قرار نہیں دیا جاسکتا۔ کامیابی کا اصل معیار یکسوئی، خلوص، بے لوٹی، قربانی اور استقامت کے ساتھ اپنی دعوت کو بغیر کسی معدترت اور مفاہمت کے اپنے عمل سے پیش کرنا ہے۔ بہترین دعوت عملی دعوت ہے۔ زبان کی قوت بلاشبہ ایک انعام ہے لیکن اس سے محرومی کے باوجود اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰؑ کو اپنا نبیؑ اور رسولؐ بنانا پسند فرمایا اور ان کے بھائی ہارونؑ کے ذریعے ان کی مدد فرمائی، جب کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو بچپن سے عرب کے سب سے زیادہ فضیح قبیلے کی لغت اور زبان کو سننے اور اختیار کرنے کا موقع ملنے کے سبب کم سے کم الفاظ میں زیادہ سے زیادہ مفہوم ادا کرنے کی صلاحیت سے نوازا گیا۔ یہ تمام پہلو تنقیدی نگاہ سے

بار بار غور کرنے کے ہیں اور پھر آئندہ پانچ برسوں کے لیے بذریعہ ایک حکمت عملی کی تیاری بلا تاخیر کر لینے کی ضرورت ہے۔ یہ حکمت عملی دعویٰ حکمت عملی کے ضمیمے کے طور پر مرتب ہونی چاہیے تاکہ ہر ہر معاملے میں تحریک کے اصول عوام کے سامنے مثالی شکل میں آسکیں اور سیاسی فیصلے کرنے میں انھیں مدد و رہنمائی جاسکے۔

منصوبہ بندی اور مستقبل کا لائچہ عمل تحریکاتِ اسلامی کے لیے ایک دینی فریضے کی حیثیت رکھتا ہے، اس لیے انتخابات یا اس جیسے دیگر امتحانات سے گزرنے کے بعد سالوں اور مہینوں کا انتظار کیے بغیر اس بات کی ضرورت ہے کہ تحریک اور تحریک سے باہر کے ایسے افراد پر بنی ایک کمیٹی ترتیب دی جائے جو نہ صرف حالیہ انتخابات بلکہ لذت شتمہ تمام انتخابات کا مختلف زاویوں سے جائزہ لے کر آئندہ چھٹے ماہ میں ایک مفصل حکمت عملی تجویز کرے، جسے آئندہ پانچ سالہ منصوبے کے طور پر ہر سال میں ترجیحات کی شکل میں مشاورت کے بعد نہ صرف قرارداد کی شکل دی جائے بلکہ ایک با اختیار شعبہ ان اقدامات کے نفاذ، ان کے ہر تین ماہ میں جائزے اور اس کی روشنی میں مزید اقدامات کروانے کا مجاز ہو۔ اختیارات کے بغیر کوئی کام نتائج پیدا نہیں کر سکتا۔ تجزیہ و تحلیل اگر حصول نتائج میں مددگار نہ ہو تو محض ہفتی ورزش ہی ہو گی جس سے ہم اللہ کی پناہ مانگتے ہیں۔

۵ سالہ خریدار بنیتے

اس میں آپ کا فائدہ ہی فائدہ ہے، ۱۰۰۰ اروپے سے زیادہ کی بچت اور سہولت!

اور ۳٪ دفعہ کی پریشانی سے نجات!

صرف ۵۰۰ اروپے میں قیمتی نگارشات پر مشتمل ۶۷۲ صفحات یعنی ایک روپے میں ۲/۱ صفحات

۲۰۰ نٹارے میں ۲۱۰۰ روپے کے بجاے ۱۵۰۰ اروپے میں = ۲۰۰ روپے

۳٪ دفعہ تسلیم زر یا وی پنی کے اخراجات ۵۰x۳ = ۲۰۰ روپے

• قیمت میں متوقع اضافہ ۵ روپے = ۳۰۰ روپے

اور چار دفعہ زرسالہ بھیجنے میں جگہ کریں، وقت لگا نہیں، اس کی بچت، اپنی حیثیت کے مطابق قیمت آپ خود لگائیں

درست فیصلہ کیجیے — اور آج ہی کیجیے!

پہلک لاتہریروں، تعلیمی اداروں، جیلوں کے لیے ہر یہ کیجیے

آئندہ ماہ نفع زیادہ ہے، ۲۰۰ گناہ سے زیادہ اجر کا۔ شاکن نہ کیجیے گا